ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

قرآن کریم میں حکمت کا مفہوم

قرآن کریم کے اندر خود اسی کتاب مقدس کے کچھ صفات اور امتیازی حقائق بیان کئے گئے ہیں کہیں اسے کتاب لاریب فیہ کہا ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یقینی ہے اس کے اندر شکوک کی گنجائش نہیں کہیں اسے فرقان کہا گیا ہے جو حق و باطل کو دو ٹوک الگ الگ کر دے۔ کہیں اس کو نور سے تشبیہہ دی گئی ہے جو زندگی کی ظلمتوں کو دور کرتا اور ارواحِ انسانی کو منیر و مستنیر کرتا ہے۔ کہیں اس کے متعلق یہ دعوہ ہے کہ وہ نبی اُمّی جو اس قرآن سے فیضیافتہ ہے بیہودہ رسوم و رواج اور گمراہ ادیان کی پہنائی ہوئی زنجیروں کو توڑتا اور توہمات کے طوق سے انسانوں کی گلوخلاصی کراتا ہے۔ کہیں یہ بیان ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے اہم شعبوں کے متعلق مفصل تعلیم موجود ہے کہیں یہ ارشاد ہے کہ تم اس کے اندر کوئی داخلی تضاد نہ پاؤ گے اس کی تمام تعلیمات باہم متوافق ہیں۔ ہر صفت اس کتاب اور اس کی تعلیم کا کوئی اہم پہلو بیان کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے:

(۱) ذلک الکتاب لاریب فیہ (یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شبہ و شک کی گنجائش نہیں)

(۲) ھدًی للناس و بینٰت من الھدیٰ و الفرقان (یہ کتاب لوگوں کیلئے ہدیٰ ہے ہدیٰ کے واضح دلائل ہیں اور فرقان ہے)

(۳) ... واتبعوا النور الذی انزل معہ (اور وہ اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو رسول امی کے ساتھ نازل کیا گیا)

(۴) ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (اور وہ اس بوجھ اور طوق کو ان پر سے ہٹاتا ہے جو ان پر پڑی تھیں)

(۵) ونزلنا علیک الکتٰب تبیانًا لکل شئ (ہم نے تم پر وہ کتاب اتاری جو تمام چیزوں کی تفصیل پر مشتمل ہے)

(۶) لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافًا کثیرًا (اگر یہ کتاب غیر خدا کی طرف سے ہوتی تو اس میں بڑے اختلافات دیکھتے)

لیکن اس مختصر مضمون میں ہم قرآن کریم کے اس دعوے کو جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ قرآنِ حکیم ہے وہ حکمت والے حکم مطلق کی نازل کردہ کتاب ہے! اس لئے اس کے اندر حکمت سموئی ہوئی ہے یہ کتاب حکمت کو خیر کثیر بھی کہتی ہے:

من یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرا۔

انبیا کے وظیفۂ نبوت کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ وہ انسانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کتاب کے ساتھ ساتھ حکمت کا بیان بالالتزام کیوں آتا ہے اور حکمت کے کیا معنی ہیں۔ ذیل میں کچھ آیات درج کی جاتی ہیں۔ جن میں کتاب و حکمت کا ساتھ ساتھ ذکر ہے:

(۱) ... لما اتیتکم من کتٰب وحکمۃ ... (۳ : ۸۱) (اے پیغمبرو! ہم نے جو تمہیں کتاب و حکمت دی ...)

(۲) ... یعلمھم الکتٰب والحکمۃ ... (۲ : ۱۲۹) و (۳ : ۱۶۴) (یہ رسولؐ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے ...)

(۳)....یعلمکم الکتب و الحکمۃ....(۲: ۱۵۱) (تمہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے)

(۴)....یعلمہ الکتب و الحکمۃ....(۳: ۴۸) (اللہ مسیح کو کتاب و حکمت سکھاتا رہا)

(۵)....فقد اتینا ال ابراھیم الکتب و الحکمۃ....(۴: ۵۴) (اور ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کیں)

(۶)....وانزل اللہ علیک الکتب و الحکمۃ....(۴: ۱۱۳) (اور اللہ نے آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائیں)

قرآن کریم کے اندر زندگی کے ہر اہم شعبے کے متعلق احکام موجود ہیں لیکن کہیں قرآن اپنے آپ کو کتاب الاحکام نہیں کہتا۔ اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ احکام صادر ہوتے ہیں بربنائے حکمت اور ہر حکم کی تہ میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے جو انفس و آفاق پر غور و خوض کرنے والوں پر ہی منکشف ہو سکتی ہے۔ حکم کو محض بحیثیت حکم پیش کرنا اور اسے واجب الاطاعت گرداننا مطلق العنان حکمرانوں کی آمریت سے سرزد ہو سکتا ہے جو بے چون و چرا محکوموں سے فرمانبرداری کے طالب ہوتے ہیں لیکن خدائے کائنات محض حاکم نہیں بلکہ حکیم بھی ہے۔ افلاطون کی مشہور کتاب جمہوریہ میں سقراط کی زبان سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانی جماعتوں اور ملتوں میں تب تک عدل حقیقی قائم نہیں ہو سکتا جب تک یہ صورت پیدا نہ ہو کہ یا تو حکما حکمران بن جائیں یا حکمران حکما بن جائیں۔ ملتوں میں اندرونی اور بیرونی فساد کی وجہ یہی ہے کہ جو حاکم اور صاحب اقتدار بن جاتے ہیں وہ حکمت سے معرا ہوتے ہیں اور جو مرد حکیم ہے اسے سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ افلاطون اور سقراط نے تقریباً اڑھائی ہزار برس قبل حکومتوں کے جس انداز کو بیان کیا ہے وہ انداز اب بھی کم و بیش ہر حکومت میں پایا جاتا ہے۔ قرآن ایسے خدا اور خلاق فطرت کو پیش کرتا ہے جو حاکم ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے۔ اس کے ہاں سے ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے سرزد ہوتا ہے۔ بے اصول حکمرانی خود خدا بھی نہیں کرتا جو قادر مطلق ہے۔ خدا ہادی ہے صرف انسانوں کا ہادی نہیں بلکہ حجر و شجر اور شمس و قمر اور ہر ذرۂ کائنات کا ہادی ہے:

ربنا اعطی کل شئ خلقہ ثم ھدی۔(۲۰: ۵۰) (ہمارے رب نے ہر شے کو اس کی مخصوص بناوٹ عطا کی پھر اس کی راہنمائی کی)

کوئی ہدایت بھی محض حکم نہیں ہوتی ہر ہدایت کا سرچشمہ بھی کوئی علت غائی ہوتی ہے اور اسی علت میں اس ہدایت کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ خدا نے دیکھا کہ دنیا کے حکمران کم و بیش حکمت سے معرا ہوتے ہیں۔ ان کے احکام میں شخصی یا خاندانی یا طبقاتی خود غرضی پنہاں ہوتی ہے۔ ان کے ہاں عدل بے لوث نہیں ہوتا لیکن انسانوں کو ہدایت اور عادلانہ زندگی کی بیحد ضرورت ہے۔ اس لئے خدا نے انبیا کو مبعوث کیا جو خدائے حکیم کے حکیمانہ احکام لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ان کو نافذ کرنے کی کوشش کریں لیکن ہر نبی کو مشیت الٰہی نے یہ توفیق عطا نہ کی کہ وہ دنیاوی زندگی میں صاحب اقتدار حکمران بھی بن جائے، اکثر کے سپرد یہی وظیفہ ہوا کہ وہ صاحب اقتدار طبقوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں اور انسانوں کے ضمیروں کو بیدار کریں۔ ان کو ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کریں ظلم سے کنارہ کشی کی تلقین کریں اور معاشرتی عدل پر آمادہ کریں۔ ان میں سے اکثر کی صدا صدا بہ صحرا رہی یا ضمائر انسانی میں محض ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوئیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ سب انبیا اوامر و نواہی کی تلقین کے ساتھ ساتھ حکمت آموزی بھی کرتے تھے۔ وہ صاحبان حکمت بھی تھے۔ وہ اعمال کے فطری اسباب و علل سے بھی لوگوں کو آگاہ کرتے تھے اور جو کچھ وہ کہتے تھے اس کے معقول ہونے کی کچھ نہ کچھ وجہ بھی بتاتے تھے نفوس انسانی کی بیماریوں کی تشخیص کرتے اور ان کا علاج بھی تجویز کرتے تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انبیا اور حکما دو الگ الگ گروہ ہیں اور اس تفریق کی بنا پر یہ تصور ہے کہ انبیا جو کچھ کہتے ہیں وہ

استدلال سے حاصل کردہ حکمت نہیں ہوتی بلکہ براہِ راست مبدا رفیاض سے حاصل کردہ ہدایت ہوتی ہے اور حکما کے متعلق یہ تصور ہے کہ وُہ محض عقل اور مشاہدہ سے فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں اور استقرا، استخراج اور قیاس سے نتائج اخذ کرتے ہیں لیکن قرآن سچی نبوت اور حقیقی حکمت میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کرتا۔ وہ اکثر انبیا کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ ان کو حکمت بھی عطا کی گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر نبی حکیم بھی ہوتا ہے لیکن ہر حکیم نبی نہیں ہوتا۔ اصل حکمت وہ ہے جو نبوت کے ساتھ وابستہ ہو۔ اگر حکمت نبوت سے مطلقاً منقطع ہو جائے تو اس کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی حکمت محض ظن آفرینی اور استدلالی بھول بھلیاں ہو اور دوسرے یہ کہ وُہ مظاہر فطرت کے کسی گوشے کے متعلق کوئی جزئی معلومات ہو جو براہِ راست انسانی زندگی میں مؤثر نہ ہو۔

حکمت کے مفہوم میں ذرا مزید وضاحت کی ضرورت ہے یہ لفظ دینیات سے الگ ہو کر کبھی فلسفہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی سائنس کے معنوں میں۔ فلسفہ کے مسائل اور دین کے مسائل بہت حد تک مشترک ہوتے ہیں۔ اور ان مسائل کے حل کے راستے کچھ دُور تک متوازی چلتے ہیں لیکن خاص حدود سے آگے طرزِ استدلال اور حقیقت رسی کے وسائل ایک دُوسرے سے ممتاز اور مختلف ہو جاتے ہیں فلسفی بھی زندگی کی اساسی اور کلی صداقتوں اور بنیادی حقیقتوں کو جاننا چاہتا ہے اور دین بھی انھیں حقائق کا نام ہے عقل ایک خُداداد جوہر ہے اور انسان کی امتیازی خصُوصیت ہے اسی لئے قرآن نے عقل کو استعمال کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ وہ جو تعلیم بھی بذریعہ وحی زبانی پیش کرتا ہے اس کے متعلق ساتھ ہی کہہ دیتا ہے کہ تفکّر اور تدبر کرنے والے اولوالالباب اگر اچھی طرح مشاہدہ مطالعہ اور استدلال کریںگے تو اس کو درست پائیںگے عقل و وحی کا امتیاز اور فرق موجود ہے لیکن قرآن انکے باہمی تخالف کا قائل نہیں۔ اگر ان میں تخالف ہوتا تو قرآن اپنے آپ کو حکمت کی کتاب نہ کہتا اور نہ مظاہر فطرت کے مطالعہ سے حقیقت رسی پر اسقدر زور دیتا۔ قرآن کی تعلیم میں یہ یقین موجود ہے کہ حکمت کا صحیح استعمال انجام کار حقائقِ دینیہ کی ضرور تائید کرے گا۔ قرآن حکیمانہ جدوجہد کو جزوِ دین اور جزوِ عبادت سمجھتا ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ شرحِ صدر سے سوچنے والے فلسفی اور نبی میں فرق کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ نبی کے ہاں صرف مشاہدۂ کائنات اور استدلال ہی نہیں بلکہ براہِ راست کچھ حقائق کا وجدان اور ادراک ہے یقین فلسفی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن وُہ علم الیقین کی حد تک رہتا ہے۔ اس سے آگے عین الیقین اور آگے بڑھ کر حق الیقین کا درجہ ہے یہ آخری دو درجے محض استدلال سے حاصل نہیں ہو سکتے سوانح میں ابوسعید ابوالخیر مشہور صوفی اور اس کے ہمعصر بوعلی سینا کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بوعلی ان کے سامنے حقائقِ حیات و کائنات پر عقلی گفتگو کرتا رہا اور از روئے عقل و حکمت ان تمام حقائق کی تائید کرتا گیا۔ جن کی تعلیم دین میں ملتی ہے۔ ابوسعید نے اس تمام حکیمانہ استدلال کے جواب میں فقط یہ کہا: "ہرچہ تو مے دانی من می بینم"۔ یہ دانش اور بینش کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو اقبالؒ نے بھی جابجا مختلف و دلکش پیرایوں میں بیان کیا ہے:

عقل گو آستاں سے دُور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں

یہ حضُور نہی ہے جسے کوئی مشاہدہ کہتا ہے کوئی وجدان کہتا ہے کوئی مکاشفہ کہتا ہے۔ انبیا کے ہاں اس کی جو صورت

اور جو درجہ ہے اسے وحی کہتے ہیں۔ اقبال نے اس کے لئے عشق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ رومی اور بوعلی کا مقابلہ کرتے ہوئے وُہ اسی عشق کو سوزِ دل قرار دیتا ہے جس کے بغیر عقلِ خنک حقیقت شناس نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے نزدیک حکمت ایک ٹھنڈی اور بے سوز آگاہی ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　　شعر مے گردد چو سوز از دل گرفت

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم　　　دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

عشق اور سوز و وجدان اور مشاہدہ کے بغیر حکمت خیر کثیر ہونے کے باوجود خیر کامل نہیں بنتی۔ نبی کے ہاں وجدان و فکر اور قول و فعل سب ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ حکیم عقلی کے ہاں یہ ہم آہنگی لازمی نہیں۔

حکیم سوزِ محبت سے بے نصیب رہا　　　بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور

حکما کی وہ قسم جنھیں فلسفی نہیں بلکہ سائنس دان کہتے ہیں الگ نوعیت کی ہے۔ خارجی اور باطنی فطرت کے بیشمار مدارج اور بیشمار شعبے ہیں فطرت کے مظاہر کی نوعیت الگ الگ ہے۔ کہیں مادّی مظاہر ہیں کہیں نباتی کہیں حیوانی۔ کہیں اجرامِ فلکی کا عالم ہے، کہیں انسانی جسم کا مطالعہ ہے کہیں اس کی نفسیات کا۔ خدائے واحد کی کائنات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اس کا کوئی حصّہ دوسرے حصّوں سے مطلقاً بے تعلق نہیں لیکن اس وحدت کے اندر ایک بے پایاں تنوع اور کثرت ہے جو بیک وقت کسی انسان کے محدود مطالعہ اور مشاہدہ اور استدلال کے احاطے میں نہیں آسکتی۔ انسان کی محدود قوتوں نے مظاہرِ عالم کے مطالعہ کے لئے ان کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کر دیا تاکہ کسی ایسے شعبے کے آئین ادراک کی گرفت میں آسکیں۔ کوئی سائنسدان تمام عمر ایک کیڑے کے مطالعہ میں صرف کر دیتا ہے کوئی انسان کے کسی ایک عضو کے اعمال و وظائف میں مہارت پیدا کرتا ہے۔ کوئی ذرّے یا ایٹم کی انتہائی تحقیق میں منہمک ہے۔ یہ سب حکمت ہی کے گرویدہ اور اسی کے متلاشی ہیں لیکن جزوی حقائق کی تحقیق کے لئے جزوی عقل ہی استعمال ہوتی ہے۔ علوم میں جس قدر تخصیص ترقی کرتی جاتی ہے۔ اسی قدر ایک سائنس دان ایک جزو کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر اجزائے حیات و کائنات سے جاہلِ مطلق ہوتا جاتا ہے۔ وُہ کم سے کم چیز کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش میں کلیاتِ حیات سے بیگانہ ہو جاتا ہے لیکن زیرِ تحقیق جزو کے بھی اگر وہ تمام پہلو جان جائے تو وُہ بھی حقائقِ کلیہ سے آشنا ہو جائے، مگر وُہ خود اپنے مطالعہ کو خاص حدود کے اندر کر لیتا ہے۔ ہر جزو ایک کل کا جزو ہے اور وُہ کل پھر کسی اور کل کا جزو ہے۔ الیٰ لا نہایت۔ مشہور انگریز شاعر ٹینی سن ایک پھول کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اگر مجھے تیری پوری حقیقت معلوم ہو جائے تو انسان اور خدا کی معرفت بھی مجھے حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم میں حکمت کا تصوّر اور نصب العین یہی ہے۔ قرآن فطرت کے مطالعہ کی تلقین کرتا ہے لیکن یہ تاکید کرتا ہے کہ فطرت کے ہر مظہر کو اس کے مصدرِ مطلق اور خلاقِ واحد کے ساتھ وابستہ کر کے سمجھو اور یہ دیکھو کہ فطرتِ کلی اور فاطر السمٰوٰت والارض کے ساتھ اس کا رابطہ کس قسم کا ہے اور کس طرح ہر جزو کل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک حکمت اسی کا نام ہے۔ فطرت کے جزوی مظاہر اور ان کے مطالعہ میں کھو جانا حکمت نہیں۔ وہ حکمت جسے

قرآن خیر کثیر کہتا ہے محض انسانی اعمال اور ان کے متعلق احکام سے بلند تر چیز ہے۔ اگرچہ اعمال کے صحیح آئین اسی حکمت سے سرزد ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کے اعمال کائنات کی حقیقتِ کلی سے منقطع اور الگ نہیں ہو سکتے۔ ایک حکمت وہ ہے جو محض ذرائع اعمال اور وسائلِ حیات کے علم تک محدود ہے لیکن قرآن جسے حکمت کہتا ہے وہ مقاصدِ حیات کا علم ہے۔ اگر حکمت کی جدوجہد مقاصدِ حیات تک نہ پہنچ سکے اور انسانی زندگی کے نصب العین کو واضح نہ کر سکے تو وہ ادھوری رہ جاتی ہے۔ اور بعض اوقات ادھورا علم جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ؎

قدم برون منہ از جہل یا فلاطوں شو　　اگر میانہ گزینی سراب و تشنہ لبی است

قرآن کریم کی تعلیم کی اساس توحید ہے یعنی حیات و کائنات کا سرچشمہ وجود اور مصدرِ ہستی ایک ہی ذات ہے۔ فلسفی اور سائنسدان مظاہرِ وجود میں علت و معلول سبب و اثر کے رابطے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عام زبان میں بھی کسی چیز یا کسی واقعہ کو جاننے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ انسانی عقل اس کو کسی قاعدے کسی قانون کے تحت میں لے آئی ہے۔ قانون کے معنی تغیر میں ثبات کی تلاش ہے۔ عالم ظاہر و باطن میں ہر مظہر ہر وقت تغیر پذیر رہتا ہے۔ بادی النظر میں تمام ہستی تغیر پذیر معلوم ہوتی ہے۔ کثرت ظاہر ہے اور وحدت پنہاں۔ جب انسان متغیر حوادث کی کثرت میں کسی آئین کو تلاش کر لیتا ہے تو کثرت اور تغیر میں ثبات اور وحدت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ حکمت کی تلاش میں انسان جزئیات کو کلیات میں پروتا چلا جاتا ہے۔ پھر کئی کلیات کو کسی ایک کلیہ کے تحت میں لے آتا ہے۔ عقل و فہم کی ترقی سے کلیات کی تعداد اوپر چڑھتے چڑھتے کم ہوتی جاتی ہے۔ نباتات میں ہر اگنے والی چیز اپنا مخصوص رنگ روپ رکھتی ہے اور اس کے نشو و نما کا قانون بھی مخصوص ہوتا ہے لیکن ماہر نباتات اس تنوع اور کثرت کو انواع کے تحت میں لا کر مخصوص انواع کے مخصوص قوانین تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح حیوانات کا ماہر ان کے اقسام بناتا ہے اور ہر قسم کا ایک نام تجویز کرتا ہے۔ یہ نام کسی ایک فرد کا نام نہیں ہوتا بلکہ ایک نوع کا نام ہوتا ہے جس کے اندر لاتعداد افراد کچھ صفات کی مماثلت کی بدولت علم کے لحاظ سے ایک لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بھی علم کا یہی مفہوم ہے۔ آدم کے قصے میں تمام ملائکہ پر انسان کی فضیلت اسی بنا پر ثابت ہوئی کہ اس کو تمام اشیا کے نام معلوم ہو گئے۔ بے شمار درختوں کو اس نے درخت کہا، طرح طرح کے چھوٹے بڑے پتھروں کو اس نے پتھر کہا۔ اسی کا نام عقل اور علم ہے۔ اور اسی راستے پر ترقی کرتے چلے جانا حکمت کی ترقی ہے۔ قرآن کا نظریہ اور اسکی تعلیم یہ ہے کہ یہ لامتناہی کثرت اور تغیرات کی کائنات ایک وحدت سے سرزد ہوئی ہے اور اس کو سمجھنے کا بھی لازمی طریقہ یہی ہے کہ انسان کہیں بھی کثرت کو کثرتِ محض نہ سمجھے بلکہ ہر قدم پر اس کو چھوٹی یا بڑی وحدتوں کی طرف لوٹاتا جائے۔ یہاں تک کہ وہ ایک وحدتِ کلی تک پہنچ جائے جو اول بھی ہے اور آخر بھی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ تمام علمی اور عملی کوششوں کا منتہی بھی خدا ہے اور تمام حکمت کا مقصود بھی ہستی کی وحدت کا فہم ہے۔ قرآن جو خالص توحید کی تعلیم دیتا ہے وہ درحقیقت معرفتِ کائنات کا درس ہے۔ علم کی زبان میں جسے آئین یا قانون کہتے ہیں۔ قرآن کی زبان میں اس کو سنت اللہ کہا گیا ہے جس کے متعلق کئی جگہ دہرایا گیا ہے کہ تم اس میں کوئی تغیر یا تلون نہ پاؤ گے۔ خلاقِ کائنات اور ہادیٔ وجود کی مشیت کچھ ثابت و قائم اصول

رکھتی ہے۔ خدا کا چاہنا اور اس کا ارادہ انسانی خواہش اور ارادے کی طرح نہیں جو کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ آئینِ حیات کو قائم و دائم رکھنا خدا کا ایک وعدہ ہے اور خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا ان اللہ لا یخلف المیعاد سائنس میں کسی نظریہ کی صداقت اسی سے جانچی جاتی ہے کہ اس کے مطابق جو پیش گوئی یا پیش بینی کی جائے، بعد میں آنے والے حوادث و مظاہر اسکی تصدیق کریں۔ گویا سائنس کا مدار بھی ان اللہ لا یخلف المیعاد۔ ہی پر ہے۔ انسان کی فطرت ہو یا کائنات کے کسی شعبے کی فطرت سب کے متعلق قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لا تبدیل لخلق اللہ قرآن کے نزدیک اسی کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نام دین ہے اور اسی کی معرفت حکمت ہے۔ دنیا کے کسی مذہبی صحیفہ میں یہ تعلیم اس وضاحت کے ساتھ نہیں ملتی۔ دین کی ماہیت کو قرآن ہی نے ہمیشہ کے لئے واضح کیا ہے اور عقل و حکمت کے ساتھ اس کا لزوم بتایا ہے:

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ ذالک دین القیم

اللہ کی اس فطرت کو دیکھو جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے قوانینِ خلق میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی ہے دینِ قیم۔

قرآن نے پہلے انبیا کی نسبت بھی یہ فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو عقائد و اعمال کے فطری علل و اسباب اور نتائج سے بھی آگاہ کرتے تھے محض حکم ہی نہیں سناتے تھے بلکہ اس کی حکمت بھی واضح کرتے تھے، پہلے انبیا کے احکام زمان و مکان اور مخصوص مزاج اقوام کے مطابق تھے اسی لئے جو حکمت وہ پیش کرتے تھے وہ بھی محدود و مخصوص تھی۔ کلم الناس علی قدر عقولهم نبوت اور حکمت دونوں کیلئے لازمی قاعدہ ہے

آخر میں جب ابدی حقائق پیش کرنے والا عالمگیر دین آیا تو اس میں حکمت کا پہلو بھی تمام موجودات اور تمام عالم انسانی پر محیط ہوگیا۔ قرآن کے نزول کے بعد دین اور حکمت کے دائرے الگ الگ نہیں رہے۔ بعض قسم کے فلسفوں اور دین میں تو تصادم ہو سکتا ہے، لیکن مظاہر فطرت میں آئین کی جستجو اور دین اسلام میں باہمی تضاد و تخالف کا کوئی امکان نہیں۔ قرآن مختلف سائنسوں کے جزئی اور مخصوص معلومات کی تعلیم نہیں دیتا، نہ وہ فلکیات کی کتاب ہے اور نہ طبیعیات و کیمیا و ریاضی کی کتاب لیکن تمام سائنس کی بنیادوں کو قرآن نے استوار کر دیا ہے۔ سائنس کی تمام اساس یہی ہے کہ مظاہر متغیر ہیں لیکن ان کے قوانین تغیر پذیر نہیں کسی شعبۂ کائنات کا قانون کبھی کچھ اور کبھی کچھ ہو جائے تو یہ کائنات، کائنات نہ رہ سکے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، اجرام فلکیہ بے آئینی سے قائم نہ رہ سکیں بلکہ قیام کا تو کیا سوال ان کا وجود ہی سرے سے ناممکن ہو جائے۔ جو چیز عدم سے وجود میں آتی ہے وہ ایک خاص انداز سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی قدرت اور اس کے خزانے لا متناہی ہیں لیکن جو کچھ معرض وجود میں آتا ہے وہ ایک خاص اندازے اور تناسب کے ساتھ آتا ہے:

انا کل شیء خلقنہ بقدر ۵ (۵۴ : ۴۹) (ہم نے ہر ہر چیز کو ایک خاص اندازے سے پیدا کیا ہے)

ہستی کی اسی ماہیت کو قرآن میزان بھی کہتا ہے:

اللہ الذی انزل الکتب بالحق والمیزان .... (۴۲ : ۱۷) (اللہ نے ٹھیک ٹھیک کتاب بھی اُتاری اور میزان بھی)

قدیم زمانے میں اکثر مذاہب کے معتقدین نے یہ عقیدہ قائم کر لیا تھا کہ ہر قسم کی سائنس کے نظریات ان کے مذہبی صحیفے میں از روئے وحی درج ہیں اس لیے کسی سائنس دان نے شجر و حجر اور شمس و قمر کے متعلق جو کچھ کہا اس کو اس نظر سے دیکھا گیا کہ وہ مذہبی صحیفہ میں بیان کردہ تعلیم کے مطابق ہے یا مخالف۔ فلکیات کے بطلیموسی قیاسات کو دین کا جزو سمجھ لیا تھا۔ جب جدید تجربانی سائنس نے ان کی تائید نہ کی تو گیلیلو جیسے محقق کو قابل تعزیر قرار دیا۔

یورپ میں مذہب اور سائنس کی کشاکش نے ضمائر انسانی کو بہت مضطرب کیا اور یہ اضطراب اب بھی باقی ہے۔ سائنس کا آغاز مسلمانوں کی تجربانی تحقیقات سے ہوا لیکن کسی مسلمان مفکر کی ان کوششوں کو ملعون اور مرتدانہ قرار نہیں دیا گیا۔ فطرت کے مظاہر میں آزادانہ طور پر تحقیق و تدقیق سے آئین تلاش کرنا ایک بین حکم قرآنی تھا۔ لہٰذا دین اور سائنس کی باہمی جنگ نہ اسلام کی تاریخ میں پہلے نظر آتی ہے اور نہ اب اس کا امکان ہے سوا اس کے کہ اسلام اور قرآن ایسے جامد اور کوتاہ بین فقیہوں اور مفسروں کے ہاتھ میں آجائے جو مغرب کے عیسائیوں کی طرح سائنس کے جزئیات کو بھی قرآن و حدیث میں تلاش کرنے کی سعی لاحاصل کریں۔ قرآن نے حکیمانہ زاویہ نگاہ پیدا کیا ہے جس سے ابدالآباد تک حکمت و معرفت کی راہیں کھل گئی ہیں۔ قرآن میں اگر شجر و حجر یا شمس و قمر یا برق و باراں کسی بیان میں ملتے ہیں تو اس کا مقصد کسی طبیعی سائنس کے جزئی نظریات کو پیش کرنا نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور اسلوب بیان سے مقصود حیات کو واضح کرنا ہے تشبیہات و تمثیلات کسی سائنس کے آئین و قوانین نہیں ہوتے۔ فطرت کے مظاہر کی بہت سی چیزیں زبان کے عام محاورات میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اور فصاحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ان کو دلکش انداز میں اپنے بیان میں سمو لے۔ اکثر ادیان دین نے روحانی حقائق کو تمثیلات اور تشبیہات میں پیش کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خالی منطقی استدلال عام انسانی طبائع کے لئے اتنا دل نشین اور اثر آفرین نہیں ہوتا جتنا کہ مثال اور تشبیہ۔ قرآن کہتا ہے کہ تشبیہ و تمثیل کی ماہیت فقط راسخ العلم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ کوتاہ نظر اور فتنہ انگیز لوگ الفاظ و صور میں الجھ جاتے ہیں۔ قرآن نے نہایت حکیمانہ انداز میں محکمات کو متشابہات سے الگ کر دیا ہے۔ دین کا لازمی جزو محکمات ہیں یعنی وہ محکم حقائق جو فطرت کے مطابق ہونے کی وجہ سے اٹل ہیں۔ خود جنت کے نہایت دلکش بیانات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ جنت کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی باغ ہو:

مثل الجنۃ التی وعد المتقون فیہا انہر من ماء غیر اسن ۔۔۔۔۔ (۴۷ : ۱۵)

جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اس نہ خراب ہونے والے پانی کی نہریں ہوں ۔۔۔۔

اسی طرح دوزخ کے متعلق فرما دیا کہ اس کے شعلے دلوں میں سے اٹھتے ہیں تاکہ سمجھنے والے سمجھ جائیں کہ وہ لکڑی یا کوئلہ جلانے والی بھٹی نہیں ہے۔

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (۱۰۴ : ۶، ۷) (اللہ کی وہ سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر سے اٹھتی ہے)

قرآن میں بعض جگہ فقط احکام ملتے ہیں جن کے ساتھ ہی ان کی حکمت کو بیان نہیں کیا جاتا۔ لیکن کہیں کہیں آئین سازی کے اصول کو بھی بیان کر دیا ہے۔ مثلاً شراب اور قماربازی کے متعلق نہایت اچھا استقرار کیا ہے اور ان اعمال شیاطین کی ممانعت کا سبب بتا دیا ہے۔ کوئی قاعدہ یا قانون ایسا نہیں جو ہر حالت میں ہر شخص کو نفع یا نقصان پہنچائے۔ کوئی بھی طریق کار ہو اس میں بعض لوگوں کو بعض حالات میں کچھ

فائدہ پہنچ جائیگا اور بعض کو نقصان۔ انسانی فطرت اور معاشرت کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ایسا ہونا لازمی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان اعمال سے بعض اوقات بعض لوگوں کو کچھ فائدے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن تمام انسانی معاشرت اور نفسیات پر پھیلا کر دیکھو اور اجتماعی نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لو۔ تو ان کے نقصانات ان کے منافع سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ قانون اکثریت کی بنا پر بنتا ہے۔ اس میں چند افراد کا نفع و ضرر نہیں دیکھا جاتا۔ حکمت قرآنی نے یہ بتا دیا کہ قانون کی بنا افادیت عامہ ہے۔

انگلستان کے اکثر قوانین بنتھم اور مِل کے زمانے تک نہایت مہمل اور عام خلائق کو نقصان پہنچانے والے تھے۔ ان مضر قوانین کا ماخذ کچھ مذہبی تھا اور کچھ انگلستان کا قدیم روایتی قانون۔ ان قوانین میں نہ کوئی عدل نظر آتا تھا اور نہ کوئی حکمت۔ اس لئے ان مصلحین اور مفکرین نے شدید جدوجہد کی کہ حکومت کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ قانون کی بنا افادیت پر ہونی چاہیئے۔ قانون انسان کیلئے بنا ہے انسان ہر فرسودہ اور مہمل قانون کی پابندی کے لئے نہیں بنا۔ رفتہ رفتہ اس جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ قوم کے اکابر نے حکیمانہ اور عادلانہ انداز میں سوچنا شروع کیا اور لغو قوانین کو منسوخ کروایا۔ اگرچہ اب بھی شادی اور طلاق اور وراثت کے متعلق کئی لغو قوانین موجود ہیں جو اصلاح طلب ہیں۔ انگلستان کے قدیم قانونِ وراثت میں وصیت کرنیوالا ہر وارث کو مطلقاً محروم کرسکتا تھا۔ اور ہر نکاح کرنیوالی عورت کی تمام جائداد اور تمام سرمایہ شوہر کے نام منتقل ہو جاتا تھا۔ عورت کی انفرادی حریّت اور شخصیت بالکل سوخت ہو جاتی تھی۔ قرآنی احکام اور حکمت سے ان قوانین کا مقابلہ کرکے دیکھیئے تو واضح ہو جائیگا کہ قرآن نے نوع انسان پر کتنا احسان کیا ہے اور کمزوروں کی کسقدر حمایت کی ہے۔

قرآن نے انسان کو حکمت پسند بنانے کے لئے ایک اور اہم قدم اٹھایا۔ اسلام سے قبل کے تمام مذاہب نے اپنی بنیاد معجزات یا خوارقِ عادت پر قائم کی تھی اور انسانوں کی یہ عادت راسخ ہوگئی تھی کہ ہر نبی سے یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ اپنی صداقت کے ثبوت میں کچھ معجزات دکھائے۔ یہی مطالبہ کفارِ قریش بار بار رسولِ کریم سے کرتے تھے۔ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ تم سے پہلوں میں معجزات نے کونسا ایمان پیدا کیا کہ اب پھر وہی تجربہ تمہارے ساتھ دہرایا جائے۔ خوارقِ عادت کے مطالبے کے جواب میں قرآن بار بار مناظر فطرت کو پیش کرتا ہے۔ اور فطرت کے مشاہدے سے فاطرِ فطرت پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔ تمہارے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے خواہ وہ مٹی سے گلہائے رنگا رنگ اور اثمارِ گوناگون کی پیدائش ہو، یا اجرام فلکیہ کا حساب سے گردش کرنا سب معجزات ہی ہیں۔ ان معنوں میں نہیں کہ وہ خوارقِ عادت ہیں۔ بلکہ خدا کی رحمت اور اس کی حکمت کے غیر متبدل مظاہر ہیں۔ انسان ایک طرف اپنی آفرینش سے عاجز ہے کہ ایک مکھی کا پر بھی نہیں بنا سکتا دوسری طرف عجز یہ ہے کہ ایک پتے اور ایک ذرے کی ماہیت کو بھی کماحقہ نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی واقعہ انسان کے لئے خرقِ عادت ہو تو ہو خدا کے لئے تو خرقِ عادت نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا کہتا ہے کہ میں اپنی عادت یا سنت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جس کو انسان معجزہ سمجھتا ہے وہ بھی خدا کے کسی آئین کے ماتحت ظہور میں آتا ہے۔ بقولِ عارف رومی

ع ہست بر اسباب اسبابے دگر۔ مردِ حکیم پر جس قدر ہستی کے آئین واضح ہوتے جاتے ہیں اسی قدر وہ اور پُر اسرار بنتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہر وجود کے اندر اور باہر لاتناہی ہے۔ اس مضمون کا عرفی کا ایک نہایت حکیمانہ شعر ہے۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ۔۔۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

روس کے مشہور ادیب اور عارف ٹالسٹائی نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ کلیسائی عیسائیت باری تعالیٰ کے ثبوت میں یہ معجزہ پیش کرتی ہے کہ مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوا۔ اگر میں تو خدا کا اس مسلسل معجزے کی وجہ سے قائل ہوں کہ ماں اور باپ دونوں سے کس محیر العقول طریقے سے ہر روز نئے انسان معرض وجود میں آتے ہیں۔ دیکھئے ایک عیسائی عارف و حکیم کیسے اپنی بصیرت سے وہی بات کہہ رہا ہے جو تیرہ سو برس قبل قرآن نے کہی تھی کہ خدا کو خرقِ عادت میں مت ڈھونڈو بلکہ اس کی قائم کردہ سنت اور عادت میں تلاش کرو۔ رسول کریمؐ کے مستند سوانح میں کوئی صحابی ایسا نظر نہیں آتا جو کسی خرقِ عادت یا معجزے کی وجہ سے خدا اور رسولؐ پر ایمان لایا ہو۔ جو کوئی بھی ایمان لایا وہ رسولِ کریمؐ کی سیرت ان کی راستبازی اور ان کی تعلیمات کی خوبیوں سے متاثر ہو کر جاں نثاروں کے گروہ میں شریک ہوا۔ بعض صحابیوں نے بعض مواقع پر ایسی باتیں لکھیں جو عالمِ اسباب کے محدود علم میں رہتے ہوئے ان کے لئے حیرت انگیز تھیں لیکن ان کے ایمان لانے کا موجب نہ تھیں، قرآن نے فیصلہ کر دیا کہ جو کوئی بھی ایمان کے نور سے منور ہونا چاہے وہ اسلامی تعلیمات کی خوبی کو پرکھ کر اسلام میں داخل ہو۔ اسلام نے دین کا رُخ معجزات سے فطرتِ عامہ کی طرف اور خوارقِ عادت سے حکمت طلبی کی طرف پھیر دیا۔ یہ نوعِ انسان کے ارتقا میں ایک بہت اہم قدم تھا۔

کوئی تین سال قبل میں نے امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں اسلام کے بنیادی عقائد پر ایک لیکچر دیا اور بتایا کہ قرآنی روحِ فطرت اور حکمت کا کیا تصور ہے۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ ڈاکٹر مرفی نے مجھ سے کہا کاش کہ ہمارے ہاں بھی دین کا یہ تصور ہوتا تاکہ ہم سائنس اور مذہب کی اس شدید کشاکش سے بچ جاتے جس نے ہمارے نفوس اور عقائد میں ایک پیکار برپا کر رکھی ہے۔ دین میں ہم خوارقِ عادت کو اساس قرار دیتے ہیں اور باقی تمام سائنس اور دیگر تعلیم میں فطرت کی آزادانہ تحقیق کا درس دیتے ہیں۔

اب ایک اہم سوال کا جواب باقی رہ جاتا ہے کہ جب خدا کی کتاب، کتابِ حکمت ہے تو قرآن کتاب کے علاوہ حکمت کا کیوں ذکر کرتا ہے۔ نبی کریمؐ کو حکم ہے کہ تم لوگوں کو اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ خدا اس کے تین طریقے بتاتا ہے، ایک حکمت، دُوسرا موعظت، تیسرا مباحثہ، مناظرہ یا مجادلہ۔

ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن ۔۔۔ (۱۶: ۲۵)

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ وعظ کے ذریعے دعوت دو اور بہترین طریقے سے مباحثہ کرو۔

اس میں قرآن کا مقصد انسانوں کی تین قسمیں بتانا ہے اور ہر قسم کو دعوت دینے کا طریقہ الگ ہے۔ بعض انسان، اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔ حکمت پسند ہوتے ہیں، ان کے سامنے اگر کوئی عقیدہ یا طریقِ عمل پیش کیا جائے تو وہ اس کے علل و اسباب کو جاننا چاہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس بات پر کیوں یقین کیا جائے یا اس عمل میں جس کی تلقین کی جاتی ہے کیا خوبی ہے اور جس عمل سے روکا جاتا ہے اس میں کیا بُرائی ہے۔ جب تک کسی حکم کی علت انکی سمجھ میں نہ آئے وہ اس پر عمل کرنا گوارا نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ بس یہ خدا کا حکم ہے۔ حکمت پسند شخص جب تک حکم کی ضرورت اور اس کے نتائج سے آگاہ نہ ہو فرماں برداری پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ عربوں میں علوم و فنون نہ تھے اور کتابی علم نہ تھا لیکن ان میں ایک تعداد ایسے انسانوں کی تھی جن میں غیر معمولی خداداد

ذہانت تھی۔ اگر یہ فطری صلاحیت موجود نہ ہوتی تو وہ بعد میں نظم و نسق حکومت اور تعمیر و اصلاح ملت کے لئے ایسے حیرت انگیز کام نہ کر سکتے جن کی بدولت ایک عادلانہ معاشرہ اور عظیم الشان تہذیب و تمدن قائم ہوا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اسلام کے احکام کو معقول سمجھ کر اس دین میں داخل ہوئے۔ افسوس ہے کہ موجودہ دورِ انحطاط میں ایسے خود ساختہ داعیانِ دین پائے جاتے ہیں کہ جب ان سے شریعت کے کسی حکم کی علت دریافت کی جائے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ دین کے احکام میں علت کا تلاش کرنا ضروری نہیں اور دین کا تقاضا یہ بتاتے ہیں کہ ہر حکم پر بے چون و چرا ایمان لایا جائے۔ عصرِ حاضر عقلیت اور حکمت کا دور ہے جہلا کو تو بے سمجھے دین کی پابندی کی تلقین کر سکتے ہیں لیکن علوم سے بہرہ ور لوگ جنھیں سوچنے کی عادت ہے وہ ایسا جواب پا کر دین کی ضرورت ہی پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اب تعلیم یافتہ طبقے کو حکمت ہی کے راستے سے دین کا قائل کیا جا سکتا ہے لیکن بہت سے مدعیانِ دین خود حکمت کے جوہر سے معرّا ہیں۔

نبی کریمؐ کو ایک دوسرے گروہ سے دوسرا طریقہ برتنے کو کہا گیا۔ یہ طبقہ وہ ہے جس میں حکمت طلبی کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس طبقے کیلئے وعظ و پند و نصائح اصلاحِ سیرت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ حکمت پسند طبقے کے مقابلے میں اس گروہ کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے لیکن موعظت بھی اسی واعظ کی موثر ہو سکتی ہے جس میں خود اخلاص عمل ہو۔ جس کا قول اس کے فعل کے مطابق ہو۔ ورنہ یقولون ما لا یفعلون کے گروہ کے متعلق وہی بات صحیح ہے جو حافظ علیہ الرحمہ کہہ گئے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر مے کنند ‏ چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر مے کنند

مشکلے دارم ز دانشمندِ محفل باز پرس ‏ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر مے کنند

یہ یقینی بات ہے کہ اسلام میں بہت سے لوگ نبی کریمؐ کی موعظت کی وجہ سے داخل ہوئے۔ نصیحت کی جاتی تھی رسولؐ کی زندگی خود کا ایک نمونہ ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ زندہ مثال کا اثر خالی نصیحت سے زیادہ ہوتا ہے لیکن نصیحت اور ناصح کی زندگی اگر ایک دوسرے کا آئینہ ہوں تو اثر میں بہت گہرائی اور گیرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسولؐ کی نصیحتیں اب بھی تقریر و تحریر میں صبح و شام دہرائی جاتی ہیں۔ لیکن کسی کی زندگی پر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ کہنے والے کے کردار و گفتار میں ایک وسیع خلیج حائل ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ مناظرہ بازوں کا ہے جو اپنی بات منوانے اور دوسرے کی بات کو رد کرنے پر تُلے ہوتے ہیں۔ یہ نہ حکمت پسند ہوتے ہیں اور نہ پند پذیر۔ ہر مخلص مصلح کو ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ کسی اہم دینی مسئلے پر بحث کرنے سے کوئی نبی کیسے انکار کر سکتا ہے لیکن نبی کا کام یہ ہے کہ ہر طبقے کے لئے ایک اچھی مثال پیش کرے۔ نبی کو حکم دیا گیا کہ ان سے بحث کر لیکن خوبصورت طریقے سے کسی مناظرے میں اخلاص و صداقت کو ہاتھ سے نہ دینا، دل آزار پیرایہ کا جواب صلح اور نرمی سے دینا، خواہ مخواہ دوسرے کو گرانے اور ہرانے کی کوشش نہ کرنا، غیر معمولی صالح نفوس کا کام ہے۔ اس کام کو ایک پاکیزہ نفس اور حکیمانہ مزاج رکھنے والا رحیم و کریم نبی ہی بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ عام انسانوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص دکھائی دے جو مذہبی بحث میں واقعی طالبِ حق ہو اور مہذب طریقے سے دوسرے کی سُنے اور اپنی سنائے، اور جہاں حریف سچ بات کہہ

رہا ہو، اس کی صمیم قلب سے داد دے۔ رسولِ کریمؐ نے جو لوگوں سے بحثیں کی ہیں اُن کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ ان کا اندازِ بحث سُلجھا ہُوا ہے۔ محض شخصی اور الزامی گفتگو کہیں نہ ملے گی۔

کتاب و حکمت کے متعلق بعض فقہا کا خیال ہے کہ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنّتِ رسولؐ ہے۔ اس میں کسی قدر صداقت ضرور ہے لیکن یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ سنت رسول کریمؐ کا عمل ہے جو قرآنی تعلیم کی عملی صورت ہے۔ خالی بلند افکار نے دُنیا میں کبھی انقلاب پیدا نہیں کیا جب تک کہ ان افکار کو عملی جامہ پہنانے والے دُنیا کے سامنے نہ آئے۔ اگر رسولؐ خود اپنے عمل میں قرآنِ مجسم نہ ہوتے تو محض خدا کی کتاب کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکتی۔ دُنیا میں اسلام کی بدولت جو اصلاحی انقلاب ہُوا وہ قرآن اور سیرتِ محمدؐ نے مل کر پیدا کیا۔ قرآن پر عمل کرنے سے زندگی کیا بن سکتی ہے اس کا مظاہرہ رسولؐ کے اسوہ حسنہ ہی سے ہُوا لیکن قرآن جب کتاب اور حکمت کہتا ہے تو اس میں حکمت محض سنّت کے مرادف نہیں ہے۔ اگر یوں سمجھا جائے تو اس سے یہ ایک غلط نتیجہ نکلتا ہے کہ خود کتاب میں حکمت نہیں ہے۔ قرآن تو خُدا کو حکیم اور اپنے آپ کو حکمت کی کتاب قرار دیتا ہے۔ صحیح معنی یہ ہونگے کہ نبی خدا کی کتاب کو پیش کرتا ہے اس کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے۔ مگر اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کتاب کے اندر جو حکمت ہے اس کو سننے والوں پر واضح کرتا ہے۔ اگر وہ مخاطب پر کھول کر اس کی حکمت واضح نہ کرے تو شاید وہ حکمت پنہاں رہ جائے۔ اس وقت دُنیا میں ہر علم و فن میں مستند اساتذہ کی تصنیف کردہ کتابیں موجود ہیں۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم ان کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اعلیٰ درجے کے پروفیسروں سے انھیں کتابوں کے پڑھنے کے بغیر چارہ نہیں۔ جن طالب علموں نے اعلیٰ درجے کے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ ان کے اندر محض اچھی کتابیں پڑھنے کے باوجود ایک کمی رہ جاتی ہے۔ حکمت کتاب میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن استاد کی توضیح اس کو اُجاگر کرتی اور کتاب کے ہر گوشے کو منور کر دیتی ہے۔ محض طب کی کتابیں پڑھنے سے کوئی طبیب حاذق نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ تجربہ کار اطبا سے اس نے کسبِ فیض نہ کیا ہو۔

کتاب و حکمت میں حکمت، قرآن حکیم ہی کی حکمت ہے جس کو بطون سے ظہور میں لانا اور حکم کو عمل کا جامہ پہنانا نبی کا وظیفہ ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ حکمت کوئی ایسی سنّت نہیں جو قرآن سے الگ ہو، یا اس میں کوئی اضافہ کرتی ہو۔ قرآن کے اندر کہیں احکام ہیں اور کہیں حکمت کے اُصول ہیں۔ یہی حکمت کے اُصول اصل دین ہیں، جو احکام کی اساس ہیں اور جن کی بنا پر تغیرِ حالات اور نئے ماحول میں نئے احکام کا استنباط ہو سکتا ہے۔ خود رسولِ کریمؐ نے اپنی زندگی میں اور اس کے بعد خلفائے راشدین اور ان کے بعد آئمہ مجتہدین نے ایسا ہی کیا۔